محمد حسین آزاد

ملک الشعراء، خاقانی ہند، شیخ ابراہیم ذوق

جب وہ صاحب کمال عالمِ ارواح سے کشورِ اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغِ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا۔ جن کی خوشبو شہرتِ عام بن کر جہان میں پھیلی۔ اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا۔ تو آبِ حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سِکّہ اس کے نام سے موزوں ہوا۔ اور اُس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اُردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چناں چہ اب ہرگز اُمید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جس باغ کا بلبل تھا وہ باغ برباد ہو گیا۔ نہ ہم صفیر رہے نہ ہم داستان رہے۔ نہ اس بولی کے سمجھنے والے رہے جو خراب آباد اُس زبان کے لیے ٹکسال تھا۔ وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے۔ شہر چھاؤنی سے بدتر ہو گیا۔ امراء کے گھرانے تباہ ہو گئے۔ گھرانوں کے وارث علم و کمال کے ساتھ روٹی سے محروم ہو کر حواس کھو بیٹھے۔ وہ جادو کار طبیعتیں کہاں سے آئیں، جو بات بات دل پسند انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں۔ آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغ البالی نے اس قسم کے ایجاد و اختراع کی فرصتیں دی ہیں۔ وہ اور، اور اصل کی شاخیں ہیں۔ انھوں نے اور پانی سے نشو و نما پائی ہے۔ وہ اور ہی ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں۔ پھر اس زبان کی ترقی کا کیا بھروسہ۔ کیسا مبارک زمانہ ہوگا۔ جب کہ شیخ مرحوم اور میرے والد مغفور ہم عمر ہوں گے۔ تحصیلِ علمی اُن کی عمروں کی طرح حالتِ طفولیت میں ہوگی۔ صرف و نحو کی کتابیں ہاتھوں میں ہوں گی۔ اور ایک اُستاد کے دامنِ شفقت میں تعلیم پاتے ہوں گے۔ ان نیک

نیت لوگوں کی ہر ایک بات استقلال کی بنیاد پر قائم ہوتی تھی۔ وہ رابطہ اُن کا عمروں کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ اور اخیر وقت تک ایسا نبھ گیا کہ قرابت سے بھی زیادہ تھا۔ ان کے تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھیں گے۔ مگر کیا کروں۔ جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گرانبہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ یہ اس سبب سے کہ اپنے پیارے، اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے۔ لیکن نہیں! اس شعر کے پُتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا۔ ایک صنعت کاری کی کل میں کون سے پُرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو یہ کام کا نہیں اور کونسی حرکت اس کی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہنچتا ہے۔ اسی واسطے میں لکھوں گا۔ اور سب کچھ لکھوں گا۔ جو بات ان کے سلسلہ حالات میں مسلسل ہو سکے گی ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔ شیخ مرحوم کے والد شیخ محمد رمضانؔ ایک غریب سپاہی تھے۔ مگر زمانہ کے تجربہ اور بزرگوں کی صحبت نے انہیں حالاتِ زمانہ سے ایسا باخبر کیا تھا کہ اُن کی زبانی باتیں کتب تاریخ کے قیمتی سرمائے تھے۔ وہ دِلّی میں کابلی دروازہ کے پاس رہتے تھے۔ اور نواب لطف علی خاں نے انھیں معتبر اور باقیات شخص سمجھ کر اپنی حرم سرا کے کاروبار سپرد کر رکھے تھے۔ شیخ علیہ الرحمۃ ان کے اکلوتے بیٹے تھے۔ کہ ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت کسے خبر ہوگی کہ اس رمضان سے وہ چاند نکلے گا۔ جو آسمانِ سخن پر عید کا چاند ہو کر چمکے گا۔ جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ غلام رُسول نام ایک شخص بادشاہی حافظ ان کے گھر کے پاس رہتے تھے۔ محلّہ کے اکثر لڑکے انھی کے پاس پڑھتے تھے۔ انھیں بھی وہیں بٹھا دیا۔

حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے۔ شوق تخلّص کرتے تھے۔ اگلے وقتوں کے لوگ جیسے شعر کہتے ہیں ویسے شعر کہتے تھے۔ محلّہ کے شوقین نوجوان دلوں کی اُمنگ میں اُن سے کچھ کچھ لکھوا لے جایا کرتے تھے۔ اکثر اصلاح بھی لیا کرتے تھے، غرض ہر وقت اُن کے ہاں یہی چرچا رہتا تھا۔ شیخ مرحوم خود فرماتے تھے کہ وہاں سنتے سنتے مجھے بہت شعر یاد ہو گئے۔ نظم کے پڑھنے اور سننے میں دل کو ایک روحانی لذّت حاصل ہوتی تھی۔ اور ہمیشہ اشعار پڑھتا پھرا کرتا تھا۔ دل میں شوق تھا اور خدا سے دعائیں مانگتا تھا کہ الٰہی مجھے شعر کہنا آ جائے۔ ایک دن خوشی میں آ کر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے۔ اور یہ فقط حسنِ اتفاق تھا۔ کہ ایک حمد میں تھا۔ ایک نعت میں۔ اِس عمر میں مجھے اتنا ہوش تو کہاں تھا کہ اس مبارک مہم کو خود اس طرح سمجھ کر شروع کرتا۔ کہ پہلا حمد میں ہو۔ دوسرا نعت میں ہو۔ جب یہ بھی خیال نہ تھا کہ اس قدرتی اتفاق کو مبارک فال سمجھوں۔ مگر اُن دو شعروں کے موزوں ہو جانے سے جو خوشی دل کو ہوئی۔ اُس کا مزہ اب تک نہیں بھولتا۔ انھیں کہیں اپنی کتاب میں کہیں جا بجا کاغذوں پر رنگ برنگ کی روشنائیوں سے لکھتا تھا۔ ایک ایک

کو سُناتا تھا۔ اور خوشی کے مارے پھولوں نہ سماتا تھا۔ غرض کہ اسی عالم میں کچھ کہتے رہے۔ اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے۔

اسی محلّہ میں میر کاظم حسین نام ایک ان کے ہم سن سبق تھے کہ نواب سید رضی خاں مرحوم کے بھانجے تھے۔ بیقرار تخلّص کرتے تھے۔ اور حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ مگر ذہن کی جودت اور طبیعت کی براقی کا یہ عالم تھا کہ کبھی برق تھے اور کبھی بادو باراں۔ انہیں اپنے بزرگوں کی صحبت میں تحصیل کمال کے لیے اچھے اچھے موقع ملتے تھے۔ شیخ مرحوم اور وہ اتحادِ طبعی کے سبب سے اکثر ساتھ رہتے تھے اور مشق کے میدان میں ساتھ ہی گھوڑے دوڑاتے تھے۔ انھیں دنوں کا شیخ مرحوم کا ایک مطلع ہے۔ کہ نمونہ تیزیِ طبع کا دکھاتا ہے:

ماتھے پہ تیرے جھمکے ہے جُھومر کا پڑا چاند
لا بوسہ چڑھے چاند کا وعدہ تھا چڑھا چاند

ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لا کر سُنائی۔ شیخ مرحوم نے پوچھا۔ یہ غزل کب کہی۔ خوب گرم شعر نکالے ہیں۔ انھوں نے کہا ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ انھیں سے یہ صلاح لی ہے۔ شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہوا۔ اور ان کے ساتھ جا کر شاگرد ہو گئے۔

سلسلے اصلاح کے جاری تھے۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ لوگوں کی واہ واطبیعتوں کو بلند پروازیوں کے پر لگاتی تھی۔ کہ رشک جو تلامیذ الرحمٰن کے آئینوں کا جوہر ہے، اُستاد شاگردوں کو چمکانے لگا۔ بعض موقع پر ایسا ہوا کہ شاہ صاحب نے ان کی غزل کو بے اصلاح پھیر دیا۔ اور کہا کہ طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ کبھی کہہ دیا کہ یہ کچھ نہیں پھر سوچ کر کہو۔ بعض غزلوں کو جو اصلاح دی تو اُس سے بے پروائی پائی گئی۔ اِدھر انہیں کچھ تو یاروں نے چمکا دیا۔ کچھ اپنی غریب حالت نے یہ آزردگی پیدا کی کہ شاہ صاحب اصلاح میں بے توجہی یا پہلو تہی کرتے ہیں۔ چناں چہ اس طرح کئی دفعہ غزلیں پھیریں۔ بہت سے شعر کٹ گئے۔ زیادہ تر قباحت یہ ہوئی کہ شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ وجیہہ الدین منیر تھے۔ جو براقی طبع میں اپنے والد کے خلف الرشید تھے۔ ان کی غزلوں میں توارد سے یا خدا جانے کس اتفاق سے وہی مضمون پائے گئے۔ اس لیے انہیں زیادہ رنج ہوا۔

منیر مرحوم کو جس قدر دعوے تھے اُس سے زیادہ طبیعت میں نوجوانی کے زور بھرے ہوئے تھے۔ وہ کسی شاعر کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ جس غزل پر ہم قلم اُٹھائیں اس زمین پر کون قدم رکھ سکتا ہے۔

مشکل سے مشکل طرحیں کرتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ کون پہلوان ہے جو اس نال کو اُٹھا سکے۔ غرض اُن سے اور شیخ مرحوم سے بمقتضائے سن اکثر تکرار ہو جاتی تھی۔ اور مباحثے ہوتے تھے۔ ایک دفعہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ شیخ علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ گھر کے کہے ہوئے شعر صحیح نہیں شاید آپ اُستاد سے کہوا لاتے ہوں گے۔ ہاں ایک جلسہ میں بیٹھ کر میں اور آپ غزل کہیں۔ چنانچہ اس معرکہ کی منّیر مرحوم کی غزل نہیں ملی۔ شیخ علیہ الرحمۃ کی غزل کا مطلع مجھے یاد ہے:۔

یاں کے آنے کا مقرر قاصدا وہ دن کرے

جو تو مانگے گا وہی دوں گا خدا وہ دن کرے

اگرچہ اُن کی طبیعت حاضر وفکر رسا، بندش چست اُس پر کلام میں زور سب کچھ تھا۔ مگر چوں کہ یہ ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے نہ دنیا کے معاملات کا تجربہ تھا نہ کوئی ان کا دوست ہمدرد تھا۔ اس لیے رنج اور دل شکستگی حد سے زیادہ ہوتی تھی۔ اس قیل وقال میں ایک دن سودا کی غزل پر غزل کہی۔ دوش نقش پا۔ شاہ صاحب کے پاس لے گئے۔ اُنھوں نے خفا ہو کر غزل پھینک دی کہ اُستاد کی غزل پر غزل کہتا ہے! اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اُڑنے لگا۔ ان دنوں میں ایک جگہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ اشتیاق لئے بے قرار ہو کر گھر سے نکالا۔ مگر غزل بے اصلاح تھی۔ دل کے ہراس نے روک لیا کہ ابتدائے کار ہے۔ احتیاط شرط ہے۔ قریب شام افسردگی اور مایوسی کے عالم میں جامع مسجد تک آ نکلے۔ آثار شریف میں فاتحہ پڑھی۔ حوض پر آئے وہاں میر کلو حقیر بیٹھے تھے۔ چوں کہ مشاعرہ کی گرم غزلوں نے روشناس کر دیا تھا۔ اور سن رسیدہ اشخاص شفقت کرنے لگے تھے۔ میر صاحب نے اُنھیں پاس بٹھایا۔ اور کہا کہ کیوں میاں ابراہیم؟ آج کچھ مکدر معلوم ہوتے ہو، خیر ہے؟ جو کچھ ملال دل میں تھا، انھوں نے بیان کیا۔ میر صاحب نے کہا کہ بھلا وہ غزلیں ہمیں سُناؤ؟ انھوں نے غزل سُنائی۔ میر صاحب کو اُن کے معاملہ پر درد آیا۔ کہا کہ جاؤ بے تامل غزل پڑھ دو۔ کوئی اعتراض کرے گا تو جواب ہمارا ذمہ ہے اور ہاتھ اُٹھا کر دیر تک اُن کے لئے دُعا کرتے رہے۔ اگرچہ میر صاحب کا قدیمانہ انداز تھا۔ مگر وہ ایک کہن سال شخص تھے۔ بڑے بڑے باکمال شاعروں کو دیکھا ہوا تھا۔ اور مکتب پڑھایا کرتے تھے۔ اس لئے شیخ مرحوم کی خاطر جمع ہوئی۔ اور مشاعرہ میں جا کر غزل پڑھی۔ وہاں بہت تعریف ہوئی۔

اُس دن سے جرأت زیادہ ہوئی اور بے اصلاح مشاعرہ میں غزل پڑھنے لگے اب کلام کا چرچا زیادہ تر ہوا۔ طبیعت کی شوخی اور شعر کی گرمی سننے والوں کے دلوں میں اثر برقی کی طرح دوڑنے لگی۔ اُس زمانہ

کے لوگ منصف ہوتے تھے۔ بزرگانِ پاک طینت جو اساتذہ سلف کی یادگار باقی تھے۔ مشاعرہ میں دیکھتے تو شفقت سے تعریفیں کر کے دِل بڑھاتے۔ بلکہ غزل پڑھنے کے بعد آتے تو دوبارہ پڑھوا کر سنتے۔ غزلیں اربابِ نشاط کی زبانوں سے نکل کر کوچہ و بازار میں رنگ اڑانے لگیں۔

اکبر شاہ بادشاہ تھے۔ انہیں تو شعر سے کچھ رغبت نہ تھی۔ مگر مرزا ابوظفر ولی عہد کہ بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے۔ شعر کے عاشق شیدا تھے۔ اور ظفر تخلص سے ملک شہرت کو تسخیر کیا تھا۔ اس لیے دربار شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے۔ مثلاً حکیم ثناء اللہ خاں فراق، میر غالب علی خاں سیّد، عبدالرحمٰن خاں احسان، برہان الدین خاں، راز، حکیم قدرت اللہ خاں قاسم، ان کے صاحبزادے حکیم عزت اللہ خاں عشق، میاں شکیبا شاگرد (میر تقی مرحوم)، مرزا عظیم بیگ عظیم (شاگرد سودا)، میر قمر الدین منت، ان کے صاحبزادے میر نظام الدین ممنون وغیرہ سب شاعر وہیں آ کر جمع ہوتے تھے۔ اپنے اپنے کلام سناتے تھے۔ مطلع اور مصرع جلسہ میں ڈالتے تھے۔ ہر شخص مطلع پر مطلع کہتا تھا۔ مصرع پر مصرع لگا کر طبع آزمائی کرتا تھا۔ میر کاظم حسین بیقرار کہ ولی عہد موصوف کے ملازم خاص تھے۔ اکثر ان صحبتوں میں شامل ہوتے تھے۔ شیخ مرحوم کو خیال ہوا۔ کہ اس جلسہ میں طبع آزمائی ہوا کرے تو قوت فکر کو خوب بلند پروازی ہو۔ لیکن اس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے بعد بادشاہی اجازت ہوا کرتی تھی۔ جب کوئی قلعہ میں جانے پاتا تھا۔ چناں چہ میر کاظم حسین کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہنچے۔ اور اکثر دربار ولی عہدی میں جانے لگے۔

شاہ نصیر مرحوم کہ ولی عہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے۔ میر کاظم حسین ان کی غزل بنانے لگے۔ انہیں دنوں میں جان الفنٹن صاحب شکار پور سندھ وغیرہ سرحدات سے لے کر کابل تک عہد نامے کرنے کو چلے۔ انہیں ایک میر منشی کی ضرورت ہوئی، کہ قابلیت و علمیت کے ساتھ امارت خاندانی کا جوہر بھی رکھتا ہو۔ میر کاظم حسین نے اُس عہدہ پر سفارش کے لیے ولی عہد سے شقہ چاہا۔ مرزا مغل بیگ ان دنوں میں اُن کے مختار کل تھے۔ اور وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے۔ کہ جس پر ولی عہد کی زیادہ نظرِ عنایت ہوا سے کس طرح سامنے سے سرکاتے رہیں۔ اس قدرتی پیچ سے میر کاظم حسین کو شقہ سفارش آسان حاصل ہو گیا اور وہ چلے گئے۔

چند روز کے بعد ایک دن شیخ مرحوم جو ولی عہد کے ہاں گئے۔ تو دیکھا کہ تیر اندازی کی مشق کر رہے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے۔ میاں ابراہیم! اُستاد تو دکن گئے۔ میر کاظم حسین اُدھر چلے گئے۔ تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا؟ غرض اُسی وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی۔ کہ ذرا اسے بنادو۔ یہ وہیں

بیٹھ گئے اور غزل بنا کر سُنائی۔ ولی عہد بہادر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ بھئی کبھی کبھی تم آ کر ہماری غزل بنا جایا کرو۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ ممتاز محل کی خاطر سے اکبر شاہ کبھی مرزا سلیم کبھی مرزا جہانگیر وغیرہ شاہزادوں کی ولی عہدی کے لئے کوششیں کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ مرزا ابوظفر میرے بیٹے ہی نہیں۔ مقدمہ اِس گورنمنٹ میں دائرہ تھا۔ اور ولی عہد کو بجائے ۵ ہزار روپیا کے فقط ۵ سو روپے مہینہ ملتا تھا۔ غرض چند روز اصلاح رہی اور آخر کار سرکار ولی عہدی سے للعہ۔ مہینہ بھی ہوگیا۔ اُس وقت لوگوں کے دِلوں میں بادشاہ کا رُعب وداب کچھ اور تھا۔ چناں چہ کچھ ولی عہدی کے مقدمہ پر خیال کر کے کچھ تنخواہ کی کمی پر نظر کر کے باپ نے اکلوتے بیٹے کو اِس نوکری سے روکا۔ لیکن اِدھر تو شاعروں کے جمگھٹ کی دل لگی نے ادھر کھینچا۔ اُدھر قسمت نے آواز دی کہ للعہ / نہ سمجھنا۔ یہ ایوانِ ملک الشعرائی کے چار ستون قائم ہوتے ہیں۔ موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ چناں چہ شیخ مرحوم ولی عہد کے اُستاد ہو گئے۔

دِلّی میں نواب الٰہی بخش خاں معروف ایک عالی خاندان امیر تھے۔ علومِ ضروری سے باخبر تھے۔ اور شاعری کے کہنہ مشاق۔ مگر اس فن سے ایسا عشق رکھتے تھے کہ فنا فی الشعر کا مرتبہ اسی کو کہتے ہیں۔ چوں کہ لطفِ کلام کے عاشق تھے۔ اس لیے جہاں متاع نیک دیکھتے تھے نہ چھوڑتے تھے۔ زمانہ کی درازی کے ساتھ شاعروں کی نظر سے ان کا کلام گزرانا تھا۔ چناں چہ ابتداء میں شاہ نصیر مرحوم سے اصلاح لیتے رہے۔ اور سید علی خاں غمگین وغیرہ وغیرہ اُستادوں سے بھی مشورہ ہوتا رہا۔ جب شیخ مرحوم کا شہرہ ہوا تو انھیں بھی اشتیاق ہوا۔ یہ موقع وہ تھا کہ نواب موصوف نے اہلِ فقیر کی برکتِ صحبت سے ترکِ دنیا کر کے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ چناں چہ اُستاد مرحوم فرماتے تھے۔ کہ میری ۱۹۔ ۲۰ برس کی عمر تھی۔ گھر کے قریب ایک قدیمی مسجد تھی۔ ظہر کے بعد وہاں بیٹھ کر میں وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ ایک چوبدار آیا۔ اُس نے سلام کیا اور کچھ چیز رومال میں لپٹی ہوئی میرے سامنے رکھ کر الگ بیٹھ گیا وظیفہ سے فارغ ہو کر اُسے دیکھا تو اس میں ایک خوشہ انگور کا تھا۔ ساتھ ہی چوبدار نے کہا کہ نواب صاحب نے دُعا فرمائی ہے۔ یہ تبرک بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ آپ کا کلام تو پہنچا ہے مگر آپ کی زبان سے سننے کو جی چاہتا ہے۔ شیخ مرحوم نے وعدہ کیا اور تیسرے دن تشریف لے گئے۔ وہ بہت اخلاق سے ملے اور بعد گفتگوئے معمولی کے شعر کی فرمائش کی۔ انھوں نے ایک غزل کہنی شروع کی تھی۔ اُس کا مطلع پڑھا

نگہہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی!
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

سُن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ خیر حال تو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا۔ مگر تمہاری زبان سے سُن کر اور لُطف حاصل ہوا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ عجیب اتفاق یہ کہ حافظ غلام رسول شوق (۵) یعنی استاد مرحوم کے قدیمی استاد اسی وقت آ نکلے۔ نواب دیکھ کر مسکرائے اور شیخ مرحوم نے اسی طرح سلام کیا جو سعادت مند شاگردوں کا فرض ہے۔ وہ اِن سے خفا رہتے تھے۔ کہ شاگرد میرا اور مجھے غزل نہیں دکھاتا۔ اور مشاعروں میں میرے ساتھ نہیں چلتا۔ غرض انھوں نے اپنے شعر پڑھنے شروع کر دیے۔ شیخ مرحوم نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور رخصت چاہی۔ چونکہ نواب مرحوم کے برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب نے چپکے سے کہا۔ کان بدمزہ ہو گئے۔ کوئی شعر اپنا سناتے جاؤ۔ اُستاد نے اُنھی دنوں میں ایک غزل کہی تھی۔ دو مطلع اس کے پڑھے:۔

جینا نظر اپنا ہمیں اصلا نہیں آتا!!
گر آج بھی وہ رشک مسیحا نہیں آتا
مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا!!
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

اُس دن سے معمول ہو گیا کہ ہفتہ میں دو دن جایا کرتے اور غزل بنا آیا کرتے تھے۔ چناں چہ جو دیوان معروف اب رائج ہے۔ وہ تمام وکمال انھی کا اصلاح کیا ہوا ہے۔ نواب مرحوم اگرچہ ضعف پیری کے سبب سے خود کاوش کر کے مضمون کو لفظوں میں بٹھا نہیں سکتے تھے۔ مگر اس کے حقائق ودقائق کو ایسا پہنچتے تھے کہ جو حق ہے اُس عالم میں اُستاد مرحوم کی جوان طبیعت اور ذہن کی کاوش اِن کی فرمائش کے نکتے نکتے کا حق ادا کرتی تھی۔ شیخ مرحوم کہا کرتے تھے کہ اگرچہ بڑی بڑی کاہشیں اُٹھانی پڑیں۔ مگر اُن کی غزل بنانے میں ہم آپ بن گئے۔

اِدھر ولی عہد بہادر کی فرمائشیں اُدھر نواب مرحوم کی غزلوں پر طبیعت کی آزمائشیں تھیں کہ کئی برس کے بعد شاہ نصیر مرحوم دکن سے پھرے اور اپنا معمولی مشاعرہ جاری کیا۔ شیخ علیہ الرحمتہ کی مشقیں خوب زوروں

(۵) حافظ غلام رسول کے سامنے ہی شیخ مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ چنانچہ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ وہ گلی میں ٹہل رہے تھے میں بھی ساتھ تھا۔ حافظ غلام رسول صاحب سامنے سے آ گئے۔ چنانچہ شیخ مرحوم نے اسی آداب سے جس طرح بچپن میں سلام کرتے تھے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا مگر اس ترش روئی سے گویا سو شیشے سرکے کے بہا دیے۔ جب وہ بازار میں نکلتے تو لوگ آپس میں اشارے کر کے دکھاتے کہ دیکھو میاں وہ استاد ذوق کے استاد جاتے ہیں۔

پر چڑھ گئی تھیں۔ اُنھوں نے بھی مشاعرہ میں جا کر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب نے دکن میں کسی کی فرمائش سے ۹ شعر کی ایک غزل کہی تھی۔ جس کی ردیف تھی۔ آتش و آب و خاک و باد۔ وہ غزل مشاعرہ میں سُنائی۔ اور کہا کہ اس طرح میں جو غزل لکھے۔ اُسے میں اُستاد مانتا ہوں [۶]۔ دوسرے مشاعرہ میں اُنھوں نے اس پر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب کی طرف سے بجائے خود اس پر کچھ اعتراض ہوئے۔ جشن قریب تھا۔ شیخ نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اسی طرح میں لکھا۔ مگر پہلے مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس لے گئے۔ کہ اس کے صحت وسقم سے آگاہ فرمائیں۔ انھوں نے سُن کر پڑھنے کی اجازت دی کہ ولی عہد بہادر نے اپنے شقہ کے ساتھ اُسے پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا۔ اُنھوں نے جو کچھ کہا تھا وہی جواب میں لکھ دیا۔ اور یہ شعر بھی لکھا

بود بگفتۂ من حرف اعتراض چناں!!
کسے بدیدۂ بینا فرد برو انگشت

شیخ مرحوم کا دل اور بھی قوی ہوگیا۔ اور دربار شاہی میں جا کر قصیدہ سُنایا۔ اس کے بڑے بڑے چرچے ہوئے۔ اور کئی دن کے بعد سُنا کہ اس پر اعتراض لکھے گئے ہیں۔

شیخ مرحوم قصیدہ مذکور کو مشاعرہ میں لے گئے کہ وہاں پڑھیں اور روبرو برسر معرکہ فیصلہ ہو جائے۔ چناں چہ قصیدہ پڑھا گیا۔ شاہ نصیر مرحوم نے ایک مستعد طالب علم کو کہ کتب تحصیلی اُسے خوب رواں تھیں۔ جلسہ میں پیش کر کے فرمایا کہ انھوں نے اس پر کچھ اعتراض لکھے ہیں۔ شیخ علیہ الرحمتہ نے عرض کی کہ میں آپ کا شاگرد ہوں۔ اور اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتا کہ آپ کے اعتراضوں کے لئے قابل خطاب ہوں۔ اُنھوں نے کہا کہ مجھے کچھ تعلق نہیں۔ انہوں نے کچھ لکھا ہے۔ شیخ مرحوم نے کہا غیر تحریر تو اُسی وقت تک ہے کہ فاصلہ دُوری درمیان ہو۔ جب آمنے سامنے موجود ہیں تو تقریر فرمائیے قصیدہ کا مطلع تھا

کوہ اور آندھی میں ہوں گر آتش و آب و خاک و باد
آج نہ چل سکیں گے پر، آتش و آب و خاک و باد

معترض نے اعتراض کیا کہ سنگ میں آتش کے چلنے کا ثبوت چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ جب پہاڑ کو بڑھنے کے سبب سے حرکت ہے تو اس میں آگ کو بھی حرکت ہوگی۔ معترض نے کہا کہ سنگ میں آتش کا ثبوت چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ مشاہدہ! اُس نے کہا کہ کتابی سند دو۔ انھوں نے کہا تاریخ سے ثابت ہے

(۶) یہ طنز ہے شیخ مرحوم پر کہ ولی عہد بہادر اور نواب الٰہی بخش خاں کی غزل بناتے تھے، اور استاد کہلاتے تھے۔

کہ ہوشنگ کے وقت میں آگ نکلی۔ اس نے کہا کہ شاعری میں شعر کی سند درکار ہے۔ تاریخ شعر میں نہیں چلتی۔ حاضرین مشاعرہ ان جواب وسوال کی اُلٹ پلٹ کے تماشے دیکھ رہے تھے۔ اور اعتراض پر حیران تھے کہ دفعتاً شیخ نے یہ شعر محسن تاثیر کا پڑھا:۔

پیش از ظہور جلوۂ جاناں نہ سوختیم
آتش بہ سنگ بُود کہ ما خانہ سوختیم

سُنتے ہی مشاعرہ میں غل سے ایک ولولہ پیدا ہوا اور ساتھ ہی سودا کا مصرع گزرانا۔

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا

اسی طرح اور اکثر سوال و جواب ہوئے۔ شاہ صاحب بھی بیچ میں کچھ دخل دیتے جاتے تھے۔ اخیر میں ایک شعر پر اُنھوں نے یہ اعتراض کیا۔ کہ اس میں ثبوت روانی کا نہیں ہے۔ شیخ علیہ الرحمتہ نے کہا یہاں تغلیب ہے۔ اس وقت خود شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ تغلیب کہیں آئی نہیں۔ اُنھوں نے کہا۔ کہ تغلیب کا قاعدہ عام ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ جب تک کسی اُستاد کے کلام میں نہ ہو۔ جائز نہیں ہو سکتی۔ شیخ علیہ الرحمتہ نے کہا کہ آپ نے ۹ شعر کی غزل پڑھ کر فرمایا تھا کہ اس طرح میں کوئی غزل کہیے تو ہم اُسے اُستاد جانیں۔ میں نے تو ایک غزل اور تین قصیدے لکھے اب بھی اُستاد نہ ہوا۔ معترض نے کہا۔ کہ اس وقت مجھ سے اعتراضوں کا پورا سرانجام نہیں ہو سکتا۔ کل پر منحصر رکھنا چاہئے اور جلسہ برخاست ہوا۔

اُسی دن سے اُنہیں تکمیل علوم اور سیر کتب کا شغل واجب ہوا۔ قدرتی سامان اس کا یہ ہوا کہ راجہ صاحب رام جو املاک شاہ اودھ کے مختار تھے۔ انھیں یہ شوق ہوا کہ اپنے بیٹے کو کتب علمی کی تحصیل تمام کروائیں۔ مولوی عبدالرزاق کہ شیخ مرحوم کے قدیمی استاد تھے وہی ان کے پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ اتفاقاً ایک دن یہ بھی مولوی صاحب کے ساتھ گئے۔ چونکہ اِن کی تیزی طبع کا شہرہ ہو گیا تھا۔ راجہ صاحب رام نے اُن سے کہا کہ میاں ابراہیم! تم ہمیشہ درس میں شریک رہو۔ چناں چہ نوبت یہ ہوگئی کہ اگر یہ کبھی شغل یا ضرورت کے سبب وہاں نہ جاتے تو راجہ صاحب رام کا آدمی انھیں ڈھونڈھ کر لاتا۔ اور نہیں تو اُن کا سبق ملتوی رہتا۔

کہا کرتے تھے کہ جب بادشاہ عالم ولی عہدی میں تھے۔ تو مرزا سلیم کے بیاہ کی تہنیت میں ایک مثنوی ہم نے لکھی۔ اِس کی بحر مثنوی کی بحروں سے الگ تھی۔ لوگوں نے چرچا کیا کہ جائز نہیں۔ میر نجات کی گل کشتی ہماری دیکھی ہوئی تھی۔ مگر حکیم مرزا محمد صاحبؒ زندہ تھے۔ اور میرے والد مرحوم انھیں کا علاج

کرتے تھے۔ وسعتِ معلومات اور حصولِ تحقیقات کی نظر سے ہم نے ان سے جا کر پوچھا۔ انھوں نے فرمایا کہ رواج اتفاقی ہے جو مثنوی انہی آٹھ بحروں میں منحصر ہوگئی ہے۔ ورنہ طبع سلیم پر کون حاکم ہے، جو روکے۔ جس بحر میں چاہو، لکھو۔ اُستاد کے مسودوں میں ایک پرچہ پر چند شعر اس کے نکلے تھے۔ اُن میں ساچق کا مضمون تھا۔ دو شعر اب تک یاد ہیں:

ٹھلیاں تو نہ تھیں وہ مے عشرت کے سبو تھے
یا قلزم مستی کے حبابِ لب جو تھے
لازم تھا کہ لکھ باندھتے یہ اُن کے گلو میں
ہے بند کیا عیش کے دریا کو سبو میں

چند سال کے بعد اُنھوں نے ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہہ کر سُنایا کہ جس کے مختلف شعروں میں انواع واقسام کے صنائع وبدائع صرف کئے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ایک زبان میں جو ایک ایک شعر تھا۔ ان کی تعداد ۱۸ تھی۔ مطلع اس کا یہ ہے:

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن
آب و ایلولہ ہوئے نشو نمائے گلشن

اس پر بادشاہ نے خاقانی ہند کا خطاب عطا کیا۔ اس وقت شیخ مرحوم کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔

حافظ احمد یار نے چند روز پہلے خواب میں دیکھا کہ ایک جنازہ رکھا ہے۔ بہت لوگ گرد جمع ہیں۔ وہاں حافظ عبدالرحیم کہ حافظ احمد یار کے والد تھے۔ ایک کھیر کا پیالہ لئے کھڑے ہیں۔ اور شیخ علیہ الرحمۃ کو اس میں سے چمچے بھر بھر کر دیتے جاتے ہیں۔ حافظ موصوف نے اُن سے پوچھا کہ یہ کیا معرکہ ہے اور جنازہ کس کا ہے۔ اُنھوں نے کہا یہ مرزا رفیع کا جنازہ ہے۔ اور میاں ابراہیم اُن کے قائم مقام مقرر ہوئے ہیں۔ خاقانی ہند کے خطاب پر لوگوں نے بڑے چرچے کئے کہ بادشاہ نے یہ کیا کیا۔ کہن سال اور نامی شاعروں کے ہوتے ایک نوجوان کو ملک الشعراء بنایا اور ایسا عالی درجہ کا خطاب دیا۔ ایک جلسہ میں یہی گفتگو ہو رہی تھی۔ کسی نے کہا کہ جس قصیدہ پر یہ خطاب عطا ہوا ہے۔ اُسے بھی تو دیکھنا چاہیے۔ چناں چہ قصیدہ مذکور لا کر پڑھا گیا۔ میر کلو حقیر کہ شاعر سن رسیدہ اور شعرائے قدیم کے صحبت یافتہ تھے۔ سُن کر بولے کہ بھئی انصاف شرط ہے۔ کلام کو بھی تو دیکھو۔ ایسے شخص کو بادشاہ نے خاقانی ہند کے خطاب سے ملک الشعرا بنایا تو کیا بُرا کیا۔ مجھے یاد ہے۔ جب اُستاد مرحوم نے یہ حال بیان کیا۔ اُس وقت بھی کہا تھا۔ اور

ارباب زمانہ کی بے انصافی یا اُن کی بے خبری اور بے صبری سے دق ہوکر کچھ کہتا تو فرماتے تھے۔ کہ بے انصافوں ہی میں سے کوئی باانصاف بھی بول اُٹھتا ہے۔ بے خبروں میں باخبر بھی نکل آتا ہے۔ اپنا کام کیے جاؤ۔ ۳۶ برس کی عمر تھی جب کہ جملہ منہیات سے توبہ کی اور اس کی تاریخ کہی۔

اے ذوق بگو سہ بار توبہ

مرزا ابوظفر بادشاہ ہوکر بہادر شاہ ہوئے تو انھوں نے پہلے یہ قصیدہ گزرانا:۔

روکش ترے رُخ سے ہوگیا نورِ سحر رنگِ شفق

ہے ذرّہ تیرا پرتو انور سحر رنگِ شفق

اگر چہ مرزا ابوظفر ہمیشہ انھیں دل سے عزیز رکھتے تھے۔ اور دلی رازوں کے لیے مخزنِ اعتبار سمجھتے تھے۔ مگر ولی عہدی میں مرزا مغل بیگ مختار تھے۔ جب کبھی بڑی سے بڑی ترقی یا انعام کے موقعے آئے تو اُستاد کے لئے یہ ہوا کہ للعہ/مہینہ سے صہ/ ہوگئے۔ صہ/ سے معہ/ روپے ہوگئے۔ جب بادشاہ ہوئے اور مرزا مغل بیگ وزیر ہوئے تو وزیر شاہی کا سارا کنبہ قلعہ میں بھر گیا۔ مگر اُستاد شاہی کو ۳۰ مہینا! پھر بھی اُنھوں نے حضور میں اپنی زبان سے ترقی کے لئے عرض نہیں کی۔ اِن کی عادت تھی کہ فکرِ سخن میں ٹہلا کرتے تھے۔ اور شعر موزوں کیا کرتے تھے۔ چناں چہ اِن دنوں میں جب کوئی عالی مضمون چُستی اور درستی کے ساتھ موزوں ہوتا۔ تو اس کے مرور میں آسمان کی طرف دیکھتے اور کہتے پھرتے:۔

یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے

اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

میاں عبدالعزیز خاں صاحب ایک مرد بزرگ صاحب نسبت فقیر تھے۔ شیخ مرحوم بھی اُن سے بہت اعتقاد رکھتے تھے۔ اس عالم میں ایک دن اُن کے پاس گئے۔ اور کہا کہ تخت نشینی سے پہلے حضور کے بڑے بڑے وعدے تھے۔ لیکن اب یہ عالم ہے الف کے نام ب نہیں جانتے۔ زبان تک درست نہیں۔ مگر جو کچھ ہیں۔ مرزا مغل بیگ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ خدائی کے کارخانے میں اگر چہ عقل ظاہر میں کام نہیں کرتی۔ مگر یہ دیکھو کہ جو دولت تم کو دی ہے۔ وہ اس کو بھی تو نہیں دی ہے۔ جس دعویٰ سے تم دربار میں کھڑے ہوکر اپنا کلام پڑھتے ہو۔ اس دعوے سے وہ اپنی وزارت کے مقام پر کب کھڑا ہوسکتا ہوگا۔ ادنے ادنے منشی متصدی اس کے لکھتے پڑھتے ہوں گے۔ وہ کیسا ترستا ہوگا۔ کہ نہ اِن کے لکھے کو سمجھ سکتا ہے۔ نہ اِن کا جھوٹ سچ معلوم کرسکتا ہے۔ شیخ مرحوم نے اُن کی ہدایت کو تسلیم کیا۔ اور پھر کبھی شکایت نہ کی۔

چند روز کے بعد مرزا مغل بیگ کی ترقی تمام ہوگئی۔ تمام کنبہ قلعہ سے نکالا گیا۔ نواب حامد علی خاں مرحوم مختار ہو گئے۔ جب اُستاد شاہی کا سو روپیہ مہینہ ہوا۔ ہمیشہ عیدوں اور نوروزوں کے جشنوں میں قصیدے مبارکباد کے پڑھتے تھے اور خلعت سے اعزاز پاتے تھے۔

اواخرِ ایام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے۔ جب شفا پائی۔ اور انھوں نے ایک قصیدہ غرا کہہ کر گزرانا تو خلعت کے علاوہ خطاب خاں بہادر اور ایک ہاتھی معہ حوضۂ نقرئی انعام ہوا۔

پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ کہہ کر گزرانا۔ جس کا مطلع ہے۔

شب کو میں اپنے سر بستر خوابِ راحت

اُس پر گاؤں جاگیر میں عطا ہوا۔

جس رات کی صبح ہوتے انتقال ہوا۔ قریب شام میں بھی موجود تھا۔ کہ انہیں پیشاب کی حاجت معلوم ہوئی۔ خلیفہ صاحب نے اُٹھایا۔ چوکی پائنتی لگی ہوئی تھی۔ ہاتھ کا سہارا دیا اور اُنھوں نے کھسک کر آگے بڑھنا چاہا۔ طاقت نے یاری نہ دی تو کہا۔ آہ ناتوانی۔ خلیفہ صاحب نے فرمایا شاعروں ہی کا ضعف ہوگیا۔ حافظ ویراں بھی بیٹھے تھے۔ وہ بولے کہ آپ نے بھی ضعف کے بڑے بڑے مضمون باندھے ہیں۔ مُسکرا کر فرمایا کہ اب تو کچھ اُس سے بھی زیادہ ہے۔ میں نے کہا۔ سُبحان اللہ! اس عالم میں بھی مبالغہ قائم رہے۔ خدا اسی مبالغہ کے ساتھ توانائی دے۔ میں رُخصت ہوا۔ رات اِسی حالت سے گذری۔ صبح ہوتے کہ ۲۴/ سفر ۱۲۷۱ھ جمعرات کا دن تھا۔ ۱۷ دن بیمار رہ کر وفات پائی۔ مرنے سے ۳ گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا:

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گذر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

شعرائے ہند نے جس قدر تاریخیں اُن کی کہیں۔ اُج تک کسی بادشاہ یا صاحب کمال کو نصیب نہیں ہوئیں۔ اردو اخبار ان دنوں دہلی میں جاری تھی۔ برس دن تک کوئی اخبار اس کا ایسا نہ تھا جس میں ہر ہفتہ کئی کئی تاریخیں نہ چھپی ہوں۔

خاص حالات اور طبعی عادات

شیخ مرحوم قد وقامت میں متوسط اندام تھے۔ چناں چہ خود فرماتے ہیں:۔

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ!

پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو

رنگ سانولا۔ چیچک کے داغ بہت تھے کہ ۹ دفعہ چیچک نکلی تھی مگر رنگت اور وہ داغ کچھ ایسے مناسب و موزوں واقع ہوئے تھے کہ چمکتے تھے۔ اور بھلے معلوم ہوتے تھے۔ آنکھیں روشن اور نگاہیں تیز تھیں۔ چہرہ کا نقشہ کھڑا تھا۔ اور بدن میں پھرتی پائی جاتی تھی۔ بہت جلد چلتے تھے۔ اکثر سفید کپڑے پہنتے تھے۔ اور وہ اُن کو نہایت زیب دیتے تھے۔ آواز بلند اور خوش آئند۔ جب مشاعرہ میں پڑھتے تھے تو محفل گونج اُٹھتی تھی۔ اُن کے پڑھنے کی طرز اُن کے کلام کی تاثیر کو زیادہ زور دیتی تھی۔ اور اپنی غزل آپ ہی پڑھتے تھے۔ کسی اور سے ہرگز نہ پڑھواتے تھے۔

صانع قدرت جنھیں صاحب کمال کرتا ہے انہیں اکثر صفتیں دیتا ہے۔ جن میں وہ ابنائے جنس سے صاف الگ نظر آتے ہیں۔ چناں چہ اُن کی تیزیٔ ذہن اور براقی طبع کا حال تو اب بھی اُن کے کلام سے ثابت ہے۔ مگر قوت حافظہ کے باب میں ایک ماجرا عالم شیر خواری کا اُنھوں نے بیان کیا، جسے سُن کر سب تعجب کریں گے۔ کہتے تھے مجھے اب تک یاد ہے کہ اس عالم میں ایک دن مجھے بخار تھا۔ والدہ نے پلنگ پر لٹا کر لحاف اوڑھا دیا۔ اور آپ کسی کام چلی گئیں۔ ایک بلّی لحاف میں گھس آئی۔ مجھے اس سے اور اُس کی خُرخُر کی آواز سے نہایت تکلیف معلوم ہونے لگی۔ لیکن نہ ہاتھ سے ہٹا سکتا تھا۔ نہ زبان سے پکار سکتا تھا۔ گھبراتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ تھوڑی دیر میں والدہ آ گئیں۔ اُنھوں نے اُسے ہٹایا تو مجھے غنیمت معلوم ہوا۔ اور وہ دونوں کیفیتیں اب تک یاد ہیں۔ چناں چہ میں جب بڑا ہوا تو میں نے والدہ سے پوچھا اُنھوں نے یاد کر کے اس واقعہ کی تصدیق کی۔ اور کہا فی الحقیقت اُس وقت تیری عمر برس دن سے کچھ کم تھی۔

صلاحیت طبع کے باب میں خدا کا شکر کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ایک دن آم کے درخت میں کنکوا اٹک گیا۔ میں اُتارنے کو اُوپر چڑھ گیا۔ اور ایک ٹہنی کو سہارے کے قابل سمجھ کر پاؤں رکھا۔ وہ ٹوٹ گئی۔ میں نیچے آ پڑا۔ بہت چوٹ لگی۔ مگر خدا نے ایسی توفیق دی کہ پھر نہ کنکوا اُڑایا۔ نہ درخت پہ چڑھا۔

عمر بھر اپنے ہاتھ سے جانور ذبح نہیں کیا۔ عالمِ جوانی کا ذکر کرتے تھے کہ یاروں میں ایک مجرّب نسخہ قوتِ باہ کا بڑی کوششوں سے ہاتھ آیا۔ شریک ہو کر اُس کے بنانے کی صلاح ٹھہری۔ ایک ایک جُز کا بہم

پہنچانا ایک ایک شخص کے ذمہ ہوا۔ چناں چہ ۴۰ چڑوں کا مغز ہمارے سر ہو۔ ہم نے گھر آ کر اُن کے پکڑنے کے سامان پھیلا دیے۔ اور دو تین چڑے پکڑ کر ایک پنجرے میں ڈالے۔ ان کا پھڑکنا دیکھ کر خیال آیا کہ ابراہیم ایک پل کے مزے کے لئے ۴۰ بے گناہوں کا مارنا کیا انسانیت ہے۔ یہ بھی تو آخر جان رکھتے ہیں۔ اور اپنی پیاری زندگی کے لئے ہر قسم کی لذتیں رکھتے ہیں۔ اُسی وقت اُٹھا، اُنھیں چھوڑ دیا۔ اور سب سامان توڑ پھوڑ کر یاروں میں جا کر کہہ دیا کہ بھئی ہم اِس نسخہ میں شریک نہیں ہوتے۔

اِن کی عادت تھی کہ ٹہلتے بہت تھے۔ دروازہ کے آگے لبی گلی تھی۔ اکثر اس میں پھرا کرتے تھے۔ رات کے وقت ٹہلتے ٹہلتے آئے اور کہنے لگے کہ میاں ایک سانپ گلی میں چلا جاتا تھا۔ حافظ غلام رسول ویران شاگرد رشید بھی بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ حضرت پھر آپ نے اُسے مارا نہیں؟ کسی کو آواز دی ہوتی۔ فرمایا کہ خیال تو مجھے بھی آیا تھا۔ مگر پھر میں نے کہا کہ ابراہیم آخر یہ بھی تو جان رکھتا ہے تجھے کے رکعت کا ثواب ہوگا۔ پھر یہ قطعہ پڑھا:۔

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد
کہ رحمت برآں تربتِ پاک داد
میازار مورے کہ دانہ کش است
کہ جاں دارد و جانِ شیریں خوش است

ایک دفعہ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ قطب میں تھے۔ یہ ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے۔ اس وقت قصیدہ لکھ رہے تھے۔ 'شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت۔' چڑیاں سایہ بان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں۔ اور اُن کے تنکے جو گرتے تھے۔ انھیں لینے کو بار بار اُن کے آس پاس آ بیٹھتی تھیں۔ یہ عالمِ محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا سر پر آن بیٹھی۔ اُنھوں نے ہاتھ سے اُڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی۔ اُنھوں نے پھر اُڑا دیا۔ جب کئی دفعہ ایسا ہوا۔ تو ہنس کر کہا کہ اس غیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہے۔ ایک طرف میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف حافظ ویران بیٹھے تھے۔ وہ نابینا ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ حضرت کیا؟ میں نے حال بیان کیا۔ ویران بولے کہ ہمارے سر پر تو نہیں بیٹھتی۔ اُستاد نے کہا کہ بیٹھے کیوں کر؟ جانتی ہے کہ یہ مُلّا ہے۔ عالم ہے۔ حافظ ہے۔ ابھی احل لکم الصید کی آیت پڑھ کر کلوا واشربوا. بسم الله الله اکبر کردے گا۔ دیوانی ہے؟ جو تمہارے سر پر آئے۔

فرماتے تھے کہ میں نے ساڑھے تین سو دیوان اساتذہ سلف کے دیکھے اور اُن کا خلاصہ کیا۔ خانِ

آرزو کی تصنیفات اور ٹیک چند بہار کی تحقیقات اور اس قسم کی اور کتابیں گویا اُن کی زبان پہ تھیں۔ مگر مجھے اس کا تعجب نہیں اگر شعرائے عجم کے ہزاروں شعر اُنھیں یاد تھے۔ تو مجھے حیرت نہیں۔ گفتگو کے وقت جس تڑاقے سے وہ شعر سند میں دیتے تھے۔ مجھے اس کا بھی خیال نہیں۔ کیونکہ جس فن کو وہ لئے بیٹھے تھے یہ سب اُس کے لوازمات ہیں۔ ہاں تعجب یہ ہے کہ تاریخ کا ذکر آئے تو وہ ایک صاحبِ نظر مورخ تھے۔ تفسیر کا ذکر آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا تفسیر کبیر دیکھ کر اُٹھے ہیں۔ خصوصاً تصوف میں ایک عالم خاص تھا۔ جب تقریر کرتے تھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ شیخ شبلی ہیں یا بایزید بسطامی بول رہے ہیں کہ وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود میں علمِ اشراق کا پرتو دے کر کبھی ابوسعید ابوالخیر تھے، کبھی محی الدین ابن عربی۔ پھر جو کہتے تھے ایسے کانٹے کی قول کہتے تھے کہ دل پر نقش ہو جاتا تھا۔ اور جو کچھ اُن سے سُن لیا ہے۔ آج تک دل پر نقش ہے۔ رمل و نجوم کا ذکر آئے تو وہ نجومی تھے۔ خواب کی تعبیر میں انہیں خدا نے ایک ملکہ راسخہ دیا تھا۔ اور لطف یہ کہ احکام اکثر مطابق واقع ہوتے تھے۔ اگرچہ مجھے اس قدر وسعتِ نظر بہم پہنچانے کا تعجب ہے مگر اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ اِن کے حافظہ میں اس قدر مضامین محفوظ کیونکر رہے۔

وہ کہتے تھے کہ اگرچہ شعر کا مجھے بچپن سے عشق ہے۔ مگر ابتداء میں دنیا کی شہرت اور ناموری اور تفریح طبع نے مجھے مختلف کمالوں کے رستے دکھائے۔ چند روز موسیقی کا شوق ہوا۔ اور کچھ حاصل بھی کیا۔ مگر خاندیس سے ایک بڑا صاحب کمال گویا آیا۔ اُس سے ملاقات کی۔ باتوں باتوں میں اُس نے کہا کہ جو گانے کا شوق کرے۔ اس کے لئے ۳۰۰ برس کی عمر چاہیے۔ ۱۰۰ برس سنتا پھرے اور جو سیکھا ہے اسے مطابق کرے۔ پھر سو برس بیٹھ کر اوروں کو سُنائے۔ اور اس کا لطف اُٹھائے۔ یہ سُن کر دل برداشتہ ہو گیا۔ اور یہ بھی خیال آیا کہ ابراہیم اگر بڑا کمال پیدا کیا تو ایک ڈوم ہو گئے۔ اس پر بھی جو کلاونت ہوگا۔ وہ ناک چڑھا کر یہی کہے گا کہ اتائی ہیں۔ سپاہی زادے سے ڈوم بنا کیا ضرور۔

نجوم و رمل کا بھی شوق کیا۔ اُس میں دست گاہ پیدا کی۔ نجوم کا ایک صاحب کمال مغل پورے میں رہتا تھا۔ اُس سے نجوم کے مسائل حل کیا کرتے تھے۔ ایک دن کسی سوال کا نہایت درست جواب اُس نے دیا۔ اور گفتگو ہوتے ہوتے یہ بھی کہا کہ ایک ستارہ کا حال اور اس کے خواص معلوم کرنے کے لئے ۷۷ برس چاہیے ہیں۔ سُن کر اُس سے بھی دل برداشتہ ہو گیا۔

طب کو چند روز کیا۔ اس میں خون ناحق نظر آنے لگے۔ آخر جو طبیعت خدا نے دی تھی۔ وہی خوبی قسمت کا سامان بنی۔

مکھن لال کے گنج میں ایک جوتشی پنڈت تلسی رام نابینا تھے۔ ایک مرد دیرینہ سال منشی درگا پرشاد کہ شیخ مرحوم کے قدیمی دوست تھے اور جوتشی صاحب کے پاس بھی جایا کرتے تھے۔ انھوں نے جوتشی صاحب کی بہت تعریف کی۔ اور ایک دن قرار پاکر یہ بھی اُن کے پاس گئے۔ کئی دلچسپ سلسلے گفتگوؤں کے ہوئے۔ بعدازاں اُنھوں نے بے اظہار نام اپنے زائچہ کی صورت حال بیان کی۔ جوتشی صاحب نے کہا۔ کہ وہ شخص صاحبِکمال ہو۔ اور غالباً کمال اس کا کسی ایسے فن میں ہو کہ باعثِ تفریح ہو۔ اس کا کمال رواج خوب پاوے۔ اس کے حریف بھی بہت ہوں۔ مگر کوئی سامنے نہ ہوسکے۔ وہ اسی قسم کی باتیں کہے جاتے تھے۔ جو شیخ مرحوم نے پُوچھا کہ اس کی عمر کیا ہو۔ اُنھوں نے کہا کہ ۶۷۔ ۶۸ حد ۶۹۔ یہ سُن کر شیخ مرحوم کے چہرہ پر آثار ملال ظاہر ہوئے اور خدا کی قدرت ۶۸ برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ اگر چہ عقلاً اور نقلاً احکامِ نجوم پر اعتقاد نہ کرنا چاہیے۔ لیکن واقعہ پیش نظر گذرا تھا۔ اس لئے واقعہ نگاری کا حق ادا کیا۔ میں بھی دیکھتا تھا کہ انہیں آخر عمر میں مرنے کا خیال اکثر رہتا تھا۔ ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوکر اچھے ہوئے۔ غسل صحت کا جشن قریب تھا۔ اُنھوں نے مبارک باد کا قصیدہ کہا۔ میں حسب معمول خدمت میں حاضر ہوا۔ اور وہ اس وقت قصیدہ ہی لکھ رہے تھے۔ چناں چہ کچھ اشعار اس کے سُنانے لگے۔ مطلع تھا:۔

زہے نشاط کہ گر کیجیئے اُسے تحریر
عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے سریر

اُس کے آگے شعر سُناتے جاتے تھے۔ میں تعریف کرتا جاتا تھا۔ وہ مسکراتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ جب یہ شعر پڑھا:۔

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابر سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی فیل مست بے زنجیر

بے اختیار میری زبان سے نکلا کہ سُبحان اللہ۔ رنگینی اور یہ زور۔ ظہوری کا ساقی نامہ ہوگیا۔ چپ ہوگئے اور کہا کہ اس میں زور آتا جاتا ہے۔ میں گُھلا جاتا ہے۔ اس کی جوانی ہے اور میرا بڑھاپا ہے۔ حافظ ویران سلمہ اللہ نے بیان کیا۔ اشعار بہار یہ کیسے ہیں۔ دو تین دفعہ فرمایا۔ خواجہ حافظ کا شعر بھی اس میں موقع سے تضمین کریں گے:۔

مے دو سالہ و محبوب چار دہ سالہ
ہمیں بس است سرا صحبت صغیر و کبیر

ایک دن جو میں گیا تو جو شعر پرچوں پر پریشان تھے اُنھیں ترتیب دیا تھا۔ چناں چہ سُناتے پھر شعر مذکور پڑھا۔ بعد میں اس کا قطعہ پڑھا کہ خود کہا تھا:۔

ہوا ہے مدرسہ بھی درسگاہِ عیش و نشاط
کہ شمس بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدرِمنیر
اگر پیالہ ہے صغرا تو ہے سبو کبیر
نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ اب بھی! میں نے عرض کی۔ سبحان اللہ اب اس کی کیا ضرورت رہی۔ آنکھیں بند کر کے فرمایا اُدھر ہی کا فیضان ہے۔

دِلّی میں نواب زینت محل کا مکان لال کنوئیں کے پاس اب بھی موجود ہے بادشاہ نے وہیں دربار کر کے یہ قصیدہ سُنا تھا۔ اِس برس ایک شادی کی تقریب میں مجھے دِلّی جانا ہوا۔ اسی مکان میں برات بیٹھی تھی۔ فتح دہلی کے بعد گورنمنٹ نے وہ مکان سرکار پٹیالہ کو دے دیا ہے۔ بند پڑا رہتا ہے۔ اب اتنے ہی کام کا ہے۔ کہ اُدھر کے ضلع میں کوئی برات یا شادی کا جلسہ ہوتا ہے تو داروغہ سے اجازت لے کر وہاں آن بیٹھے ہیں۔ واہ

کشتوں کا تیری چشم سیہ مست کے مزار
ہوگا خراب بھی تو خرابات ہوئے گا

وہ زمانہ اور آج کی حالت دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔

ان کی طبیعت کو خدا تعالیٰ نے شعر سے ایسی مناسبت دی تھی کہ رات دن اس کے سوا کچھ خیال نہ تھا۔ اور اسی میں خوش تھے۔ ایک تنگ و تاریک مکان تھا۔ جس کی انگنائی اس قدر تھی کہ ایک چھوٹی سی چارپائی ایک طرف بچھتی تھی۔ دو طرف اتنا رستہ رہتا تھا کہ ایک آدمی چل سکے۔ حقہ منہ سے لگا رہتا تھا۔ کھری چارپائی پر بیٹھے رہتے تھے۔ لکھے جاتے تھے یا کتاب دیکھے جاتے تھے۔ گرمی، جاڑا، برسات تینوں موسموں کی بہاریں وہیں بیٹھے گزر جاتی تھیں۔ اُنھیں کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ کوئی میلہ۔ کوئی عید اور کوئی موسم بلکہ دُنیا کی شادی و غم سے انھیں سروکار نہ تھا۔ جہاں اوّل روز بیٹھے وہیں بیٹھے اور جبھی اُٹھے کہ دُنیا سے اُٹھے۔

نمازِ عصر کے وقت میں ہمیشہ حاضر خدمت ہوتا تھا۔ نہا کر وضو کرتے تھے۔ اور ایک لوٹے سے برابر کلیاں کیے جاتے تھے۔ ایک دن میں نے سبب پوچھا۔ متاسفانہ طور سے بولے کہ خدا جانے کیا کیا

ہزلیات زبان سے نکلتے ہیں۔ خیر یہ بھی ایک ہے۔ پھر ذرا تامل کر کے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور یہ مطلع اُسی وقت کہہ کر پڑھا:۔

پاک رکھ اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے
کم نہیں ہرگز زباں مُنہ میں ترے مسواک سے

اُن کا معمول تھا کہ رات کو کھانے سے فارغ ہو کر بادشاہ کی غزل کہتے تھے۔ آدھی بجے تک اُس سے فراغت ہوتی تھی۔ پھر وضو کرتے اور وہی ایک لوٹے پانی سے کلیاں کر کے نماز پڑھتے۔ پھر وظیفہ شروع ہوتا۔ زیرِ آسماں کبھی ٹہلتے جاتے کبھی قبلہ رو ٹھہر جاتے۔ اگر چہ آہستہ آہستہ پڑھتے تھے۔ مگر اکثر اوقات اِس جوشِ دل سے پڑھتے تھے کہ معلوم ہوتا گویا سینہ پھٹ جائے گا۔

وظیفہ پڑھ کر دعائیں شروع ہوتی تھیں۔ یہ گویا کہ نمونہ تھا۔ اُن کی طبیعت کی نیکی اور عام نیک خواہی کا۔ اس میں سب سے پہلے یہ دُعا تھی۔ الٰہی میرے بادشاہ کو بادولت با اقبال صحیح وصالم رکھ۔ اس کے دشمن روہوں وغیرہ وغیرہ، ایک شب اس موقع پر میرے والد مرحوم انہی کے ہاں تھے۔ ساری دعائیں سُنا کیے۔ چناں چہ اُن کے دروازہ کے سامنے محلّہ کا حلال خور رہتا تھا۔ اُن دنوں میں اُس کا بیل بیمار تھا۔ دُعائیں مانگتے مانگتے وہ بھی یاد آ گیا۔ کہا کہ الٰہی جما حلال خور کا بیل بیمار ہے۔ اُسے بھی شفا دے۔ بچارا بڑا غریب ہے۔ بیل مر جائے گا تو یہ بھی مر جائے گا۔ والد نے جب یہ سُنا تو بے اختیار ہنس پڑے فقرا اور بزرگانِ دین کے ساتھ اُنہیں ایسا دلی اعتقاد تھا کہ اُس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ علماء اور اساتذہ سلف کو ہمیشہ باادب یاد کرتے تھے۔ اور کبھی اُن پر طعن و تشنیع نہ کرتے تھے۔ اس واسطے اُن کے مذہب کا حال کسی پر نہ کھلا۔

اس میں کسی کو کلام نہیں کہ انھوں نے فکرِ سخن اور کثرتِ مشق میں فنافی الشعر کا مرتبہ حاصل کیا۔ اور انشاء پردازیٔ ہند کی رُوح کو شگفتہ کیا۔ مگر فصاحت کا دل کملا جاتا ہوگا۔ جب اُن کے دیوانِ مختصر پر نگاہ پڑتی ہوگی۔ اس کے سبب کا بیان کرنا ایک سخت مصیبت کا افسانہ ہے۔ اور اس کی مرثیہ خوانی کرنی میرا فرض ہے۔ اُن کی وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسماعیل مرحوم نے کہ وہ بھی باپ کی طرح اکلوتے بیٹے تھے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں۔ متفرق غزلوں کے بستے اور بڑی بڑی پوٹیں تھیں۔ بہت سی تھیلیاں اور مٹکے تھے۔ کہ جو کچھ کہتے تھے۔ گویا بڑی احتیاط سے اُن میں بھرتے جاتے تھے۔ ترتیب اس کی پسینے کی جگہ خون بہاتی تھی۔ کیونکہ بچپن سے لے کر دمِ واپسیں تک کا کلام اُنھی میں تھا۔ بہت سی متفرق غزلیں بادشاہ کی، بہتیری غزلیں شاگردوں کی بھی ملی ہوئی تھیں۔

چناں چہ اوّل اُن کی اپنی غزلیں اور قصائد انتخاب کر لئے۔ یہ کلام کئی مہینے میں ختم ہوا۔ غرض پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کیں۔ اس خطا کا مجھے اقرار ہے کہ کام میں نے جاری کیا۔ مگر بااطمینان کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح یکایک زمانہ کا ورق اُلٹ جائے گا۔ عالم تہ و بالا ہو جائے گا۔ حسرتوں کے خون بہہ جائیں گے۔ دل کے ارمان دل ہی میں رہ جائیں گے۔ دفعتاً ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا۔ کسی کا کسی کو ہوش نہ رہا چناں چہ افسوس ہے کہ خلیفہ محمد اسماعیل اُن کے فرزند جسمانی کے ساتھ ہی اُن کے فرزند روحانی بھی دُنیا سے رحلت کر گئے۔ میرا یہ حال ہوا کہ فتحیاب لشکر کے بہادر دفعتاً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد یہاں سے نکلو۔ دُنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا۔ اور میں حیران کھڑا تھا، کہ کیا کیا کچھ اُٹھا کر لے چلوں اُن کی غزلوں کی جنگ پر نظر پڑی۔ یہی خیال آیا کہ محمد حسینؔ! اگر خدا نے کرم کیا۔ اور زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ مگر اُستاد کہاں سے پیدا ہوں گے۔ جو یہ غزلیں پھر آ کر کہیں گے۔ اب ان کے نام کی زندگی ہے اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو وہ مر کر بھی زندہ ہیں۔ یہ گئیں تو نام بھی نہ رہے گا۔ وہی جنگ اُٹھا بغل میں مارا۔ سجے سجائے گھر کو چھوڑ ۲۲ نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا۔ ساتھ ہی زبان سے نکلا کہ حضرت آدم بہشت سے نکلے تھے۔ دِلّی بھی ایک بہشت ہے۔ اُنہی کا پوتا ہوں۔ دہلی سے کیوں نہ نکلوں۔ غرض میں تو آمادہ ہو کر خدا جانے کہاں کا کہاں نکل آیا۔ مگر حافظ غلام رسول ویران کہ محبت کے لحاظ سے میرے شفیق دوست اور حضرتِ مرحوم کی شاگردی کے رشتہ سے روحانی بھائی ہیں اُنھوں نے شیخ مرحوم کے بعض اور درد خواہ دوستوں سے ذکر کیا۔ کہ مسودوں کا سرمایہ تو سب دِلّی کے ساتھ برباد ہوا۔ اِس وقت یہ زخم تازہ ہے۔ اگر اب دیوان مرتب نہ ہوا تو کبھی نہ ہو گا۔ حافظ موصوف کو خود بھی حضرت مرحوم کا کلام بہت کچھ یاد ہے۔ اور خدا نے اُن کی بصیرت کی آنکھیں ایسی روشن کی ہیں۔ کہ بصارت کی آنکھوں کے محتاج نہیں۔ اس لئے لکھنے کی سخت مشکل ہوئی۔ غرض کہ ایک مشکل میں کئی کئی مشکلیں تھیں۔ اُنھوں نے اس مہم کا سرانجام کیا۔ اور اپنی یاد کے علاوہ نزدیک بلکہ دُور دُور سے بہت کچھ بہم پہنچایا۔ سب کو سمیٹ کر ۱۲۷۹ھ میں ایک مجموعہ جس میں اکثر غزلیں تمام اور اکثر ناتمام، بہت سے متفرق اشعار اور چند قصیدے ہیں چھاپ کر نکالا۔ مگر دردمندی کا دل پانی پانی ہو گیا۔ اور عبرت کی آنکھوں سے لہو ٹپکا۔ کیونکہ جس شخص نے دُنیا کی لذتیں۔ عمر کے مختلف موسم، اور موسموں کی بہاریں۔ دن کی عیدیں، رات کی شب براتیں۔ بدن کے آرام۔ دل کی خوشیاں، طبیعت کی امنگیں سب چھوڑ دیں۔ اور ایک شعر کو لیا۔ جس کی انتہائے تمنا یہی ہو گی کہ اس کی بدولت نامِ نیک باقی رہے گا۔ تب کار

کے زمانہ ہاتھوں آج اس کی عمر بھر کی محنت نے یہ سرمایہ دیا۔ اور جس نے ادنیٰ ادنیٰ شاگردوں کو صاحب دیوان کر دیا۔ اس کو یہ دیوان نصیب ہوا۔ خیر

یونہی خدا جو چاہے تو بندہ کا کیا چلے

میرے پاس بعض قصیدے ہیں۔ اکثر غزلیں ہیں۔ داخل ہو جائیں گی۔ یا ناتمام غزلیں پوری ہو جائیں گی۔ مگر تصنیف کے دریا میں سے پیاس بھر پانی بھی نہیں۔ چناں چہ یہ تذکرہ چھپ لے تو اس پر توجہ کروں۔ مسب الاسباب سرانجام کے اسباب عنایت فرمائیے۔

جو غزلیں اپنے تخلص سے کہی تھیں۔ اگر جمع کی جائیں تو بادشاہ کے چاروں دیوانوں کے برابر ہوتیں۔ غزلوں کے دیوان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ عام جوہر ان کے کلام کا تازگی مضمون، صفائی کلام چستی ترکیب، خوبی محاورہ اور عام فہمی ہے۔ مگر حقیقت میں رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا۔ ابتدا میں مرزا رفیع کا انداز تھا۔ شاہ نصیر سے ان دنوں معرکے ہو رہے تھے۔ اُن کا ڈھنگ وہی تھا۔ اس لئے اُنہوں نے بھی وہی اختیار کیا۔ اس کے علاوہ مرزا کی طرز کو جلسے کے گرمانے میں اور لوگوں کے لب و دہن سے واہ وا کے نکال لینے میں ایک عجیب جادو کا اثر ہے۔ چناں چہ وہی شکل طرحیں، چُست بندشیں، برجستہ ترکیبیں، معانی کی بلندی، الفاظ کی شکوہ ہیں۔ اِن کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ چند روز کے بعد الٰہی بخش خاں معروف کی خدمت میں۔ اور ولی عہد کے دربار میں پہنچے۔ معروف ایک دیرینہ سال مشاق اور فقیر مزاج شخص تھے۔ اِن کی پسند طبع کے بموجب انھیں بھی تصوف اور عرفان اور درد دلی کی طرف خیالات کو مائل کرنا پڑا۔ نوجوان ولی عہد طبیعت کے بادشاہ تھے۔ ادھر یہ بھی جوان اور ان کی طبیعت بھی جوان تھی۔ وہ جرأت کے انداز کو پسند کرتے تھے۔ اور جرأت اور سید انشاء و مصحفی کے مطلع اور اشعار بھی لکھنؤ سے اکثر آتے رہتے تھے۔ اُن کی غزلیں اُنھیں کے انداز میں بناتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا۔ کہ ان کی غزل اخیر کو ایک گلدستہ گلہائے رنگا رنگ کی ہوتی تھی۔ دو تین شعر بلند خیالی کے۔ ایک دو تصوف کے دو تین معاملے کے۔ اور پیچ اس میں یہ ہوتا تھا کہ ہر قافیہ بھی ایک خاص انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے کہ اُسی میں بندھے تو لطف دے۔ نہیں تو پھیکا رہے۔ پس وہ مشاق باکمال اس بات کو پورا پورا سمجھا ہوا تھا۔ اور جس قافیہ کو جس پہلو کے مناسب دیکھتا تھا۔ اسی میں باندھ دیتا تھا۔ اور اس طرح باندھتا تھا کہ اور پہلو نظر نہ آتا تھا۔ ساتھ اس کے صفائی اور محاورہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اور انہی اصول کے لحاظ سے میرؔ، مرزاؔ، دردؔ، مصحفیؔ، سید انشاء، جرأتؔ بلکہ تمام شعرائے متقدمین کو اس ادب سے یاد کرتے تھے۔ گویا انھیں کے

شاگرد ہیں۔ ایک ایک کے چیدہ اشعار اس محبت سے پڑھتے تھے۔ گویا اُسی دستور العمل سے انھوں نے تہذیب پائی ہے۔ اور فی الحقیقت سب کے انداز کو اپنے اپنے موقع پر پورا پورا کام میں لاتے تھے۔ پھر بھی جاننے والے جانتے ہیں کہ اصلی میلان ان کی طبیعت کا سودؔا کے انداز پر زیادہ تھا۔ نظم اُردو کی نقاشی میں مرزائے موصوف نے قصیدہ پر دستکاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ اُن کے بعد شیخ مرحوم کے سوا کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا۔ اور انُھوں نے مرقع کو ایسی اُونچی محراب پر سجایا۔ کہ جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا، انوریؔ، ظہیرؔ، ظہوریؔ، نظیریؔ، عرفیؔ، فارسی کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکتے ہیں۔ لیکن ان کے قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہند کی زمین کو آسمان کر دکھایا۔ ہر جشن میں ایک قصیدہ کہتے تھے۔ اور خاص خاص تقریبیں جو پیش آتی تھیں۔ وہ الگ تھیں۔ اس لئے اگر جمع ہوتے تو خاقانی ہند کے قصائد خاقانی شروانیؔ سے دو چند ہوتے۔ جب تک اکبر شاہ زندہ تھے۔ تب تک اُن کا دستور تھا کہ قصیدہ کہہ کر لے جاتے اور اپنے آقا یعنی ولی عہد کو سناتے۔ دوسرے دن ولی عہد ممدوح اُس میں اپنی جگہ بادشاہ کا نام ڈلوا کر لے جاتے اور دربار شاہی میں سنواتے۔ افسوس یہ ہے کہ عالمِ جوانی کی طبع آزمائی سب برباد ہوئی۔ جو کچھ ہیں وہ چند قصیدے ہیں کہ بڑھاپے کی ہمت کی برکت ہے۔

نواب حامدؔ علی خاں مرحوم نے نہایت شوق سے ایک عاشقانہ خط لکھنے کی انھیں فرمائش کی تھی۔ بادشاہ کی متواتر فرمائشیں یہاں ایسے کاموں کے لئے کب فرصت دیتی تھیں۔ مگر اتفاق کہ انھی دنوں میں رمضان آ گیا۔ اور اتفاق پر اتفاق یہ کہ بادشاہ نے روزے رکھنے شروع کر دیے۔ اس سبب سے غزل کہنی موقوف کر دی۔ خیر ان کی زبان کب رہ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس نئے چمن کی ہوا کھانے کو اپنا بھی جی چاہتا تھا۔ انھوں نے وہ نامہ لکھنا شروع کیا۔ اُس نے ایسا طول کھینچا کہ تخمیناً ۳۰۰ شعر اس کے ہو گئے۔ اس عرصہ میں تین تختیاں اُس سے سیاہ ہوئی تھیں۔ مگر ادھر رمضان ہو چکا۔ بادشاہ کی غزلیں پھر شروع ہو گئیں۔ مثنوی وہیں رہ گئی۔ بیچ میں کبھی کبھی پھر بھی طبیعت میں اُمنگ اٹھی۔ مگر کبھی ایک دن کبھی دو دن ۲۰۔۲۵ شعر ہوئے پھر رہ گئے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا اور ہر وقت پاس رہنے لگا۔ تو کئی دفعہ اس کے مختلف ذکر کرتے اور جا بجا کے شعر پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن وہ تختیاں اور کاغذی مسودے نکلوائے۔ بہت کم تھا۔ جو کچھ کہ پڑھا جاتا تھا۔ آخر فرصت کے وقت نکال نکال کر اُن سے پڑھواتا گیا۔ اور آپ لکھتا گیا۔ کل ۵۵۰ شعر سے زیادہ ہوئے۔ اگرچہ نامہ ناتمام تھا۔ مگر ایک ایک مصرع سونے کے پانی سے لکھنے کے لائق تھا۔ میرے صاف کیے ہوئے مسودے بھی انھیں متفرق غزلوں میں تھے۔ جو میں خلیفہ صاحب کے پاس جا کر صاف

ٰیا کرتا تھا۔ چناں چہ اُن کے ساتھ وہ بھی گئے۔ اس کا نام نامۂ جانسوز تھا۔ اوّل حمد و نعت تھی۔ پھر ساقی نامہ۔ پھر القاب معشوق، اسی میں اُس کا سراپا اس کے بعد یاد آیام۔ اس میں چاروں موسموں کی بہار۔ مگر اس کے معنوں کی نزاکت لفظوں کی لطافت، ترکیبوں کی خوبیاں، اندازوں کی شوخیاں۔ کیا کہوں! سامری کے جادو اور جادو کے طلسم اُس کے آگے دھواں ہو کر اڑ جاتے تھے۔

کئی مخمس تھے۔ کئی رباعیاں تھیں۔ صدہا تاریخیں تھیں۔ مگر تاریخوں کی کمائی بادشاہ کے حصے میں آئی۔ کیونکہ بہت بلکہ کل تاریخیں انہی کی فرمائش سے ہوئیں۔ اور اُنھی کے نام سے ہوئیں۔ مرثیہ سلام کہنے کا اُنھیں موقع نہ ملا۔ بادشاہ کا قاعدہ تھا کہ شاہ عالم اور اکبر شاہ کی طرح محرم میں کم سے کم ایک سلام ضرور کہتے تھے۔ شیخ مرحوم بھی اسی کو اپنی سعادت اور عبادت سمجھتے تھے۔ ہزاروں گیت، ٹپے، ٹھمریاں، ہولیاں کہیں، وہ باشاہ کے نام سے عالم میں مشہور ہوئیں۔ اور ان باتوں میں اپنی شہرت چاہتے بھی نہ تھے۔ میرے نزدیک ان کے اور ان کے دیکھنے والوں کے لئے بڑے فخر کی بات یہ ہے کہ خدا نے کمال شاعری اور ایسا اعلیٰ درجہ قادر الکلامی کا انھیں دیا۔ اور ہزاروں آدمیوں سے اُنھیں ناراضی یا رنج پہنچا ہوگا۔ مگر اُنہوں نے تمام عمر میں ایک شعر بھی ہجو میں نہ کہا۔ خدا ہر شخص کو اس کی نیت کا پھل دیتا ہے۔ اس کی شان دیکھو کہ ۶۸ برس کی عمر پائی۔ مگر خدا نے اُن کی ہجو بھی کسی کے منہ سے نہ نکلوائی۔

اکثر نئے ایجاد و اختراع اِن کے ارادے میں تھے۔ اور بعض بعض ارادے شروع مگر ناتمام رہے۔ کیوں کہ بادشاہ کی فرمائشیں دم لینے کی مہلت نہ دیتی تھیں۔ اور تماشا یہ کہ بادشاہ بھی ایجاد کا بادشاہ تھا۔ اتنا تھا۔ کہ بات نکالتا مگر اُسے سمیٹ نہ سکتا تھا۔ اس کا کیا ہوا انہیں سنبھالنا پڑتا تھا۔

وہ اپنی غزل بادشاہ کو سناتے نہ تھے۔ اگر کسی طرح اُس تک پہنچ جاتی۔ تو وہ اُسی غزل پر خود غزل کہتا تھا۔ اب اگر نئی غزل کر دیں۔ اور وہ اپنی غزل سے پست ہو تو بادشاہ بھی بچہ نہ تھا۔ ۷۰ برس کا سخن فہم تھا۔ اگر اُس سے چست کہیں تو اپنے کہے کو آپ مٹانا بھی کچھ آسان کام نہیں ناچار اپنی غزل میں اُن کا تخلص ڈال کر دے دیتے تھے۔ بادشاہ کو بڑا خیال رہتا تھا کہ وہ اپنی کسی چیز پر زورِ طبع نہ خرچ کریں۔ جب ان کے شوق طبع کو کسی طرف متوجہ دیکھتا تو برابر غزلوں کا تار باندھ دیتا۔ کہ جو کچھ خوش طبع ہو ادھر ہی آ جائے۔

ایک دن معمولی دربار تھا۔ اُستاد بھی حاضر تھے۔ ایک مرشد زادے تشریف لائے وہ شاید کسی اور مُرشد زادی یا بیگمات میں سے کسی بیگم صاحب کی طرف سے کچھ عرض لے کر آئے تھے۔ انھوں نے آہستہ آہستہ بادشاہ سے کچھ کہا۔ اور رخصت ہوئے۔ حکیم احسن اللہ خاں بھی موجود تھے۔ انہوں نے عرض کی۔

صاحب عالم اس قدر جلدی؟ یہ آنا کیا تھا اور تشریف لے جانا کیا تھا۔ صاحب عالم کی زبان سے اس وقت نکلا کہ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے۔ بادشاہ نے اُستاد کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ اُستاد! دیکھنا کیا صاف مصرع ہوا ہے۔ اُستاد صاحب نے بے توقف عرض کی کہ حضور

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے!
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

یہ اواخر عمر کی غزل ہے اس کے دو تین ہی برس بعد انتقال ہو گیا۔

ایک دِن دربار سے آ کر بیٹھے۔ جو میں پہنچا۔ افسردہ ہو کہ آج عجیب ماجرا گزرا۔ میں جو حضور میں گیا تو محل میں تھے۔ وہیں بلا لیا اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ اُستاد آج مجھے دیر تک ایک بات کا افسوس رہا۔ میں نے حال پوچھا کہا کہ وہ! جو قصیدہ تم نے ہمارے لئے کہا تھا۔ اُس کے وہ اشعار آج مجھے یاد آ گئے۔ اُن کے خیالات سے طبیعت کو عجب لطف حاصل ہوا۔ مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ اب تم یہ قصیدے ہمارے لیے کہتے ہو۔ ہم مر جائیں گے تو جو تخت پر بیٹھے گا۔ اس کے لئے کہو گے۔ میں نے عرض کی کہ حضور کچھ تردّد نہ فرمائیں۔ خیمہ پیچھے گرتا ہے۔ میخیں اور طنابیں پہلے ہی اکھڑ جاتی ہیں۔ ہم حضور سے پہلے ہی اُٹھ جائیں گے۔ اور حضور خیال فرمائیں کہ عرش آرام گاہ کے دربار کے لوگ حضور کے دربار میں کہاں تھے؟ فردوس منزل کے امراء اُن کے عہد میں کہاں تھے۔ عرش منزل کے فردوس منزل کے دربار میں کہاں تھے۔ فردوسی منزل کے امیر عرش آرمگاہ کے دربار میں کہاں تھے۔ عرش آرام گاہ کے امراء آج حضور کے دربار میں کہاں ہیں۔ بس یہی فرمالیجیے جو جس کے ہوتے ہیں۔ وہ اُسی کے ساتھ جاتے ہیں۔ نیا میر مجلس نئی ہی مجلس جماتا ہے۔ اور اپنا سامان مجلس میں اپنے ہی ساتھ ہوتا ہے۔ یہ سُن کر حضور بھی آبدیدہ ہوئے۔ میں بھی آبدیدہ ہوا۔ مگر خیال مجھے یہ آیا کہ دیکھو ہم ہمیشہ نماز کے بعد حضور کی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہیں۔ خدا شاہد ہے۔ اپنا خیال اس طرح آج تک کبھی نہیں آیا۔ حضور کو ہمارا خیال بھی نہیں۔ میاں! دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہے۔

شیخ مرحوم ضعفِ جسمانی کے سبب سے روزہ نہ رکھتے تھے۔ مگر اس پر بھی کسی کے سامنے کھاتے پیتے نہ تھے۔ کبھی دوا یا شربت یا پانی بھی پینا ہوتا تو یا کوٹھے پر جا کر یا گھر میں جا کر پی آتے۔ ایک دفعہ میں نے پُوچھا۔ کہا میاں خدا کے گناہ گار ہیں۔ وہ عالم نہاں و آشکار کا ہے۔ اس کی تو شرم نہیں ہو سکتی۔ بھلا بندے کی تو شرم رہے۔

رمضان کا مہینہ تھا۔ گرمی کی شدّت، عصر کا وقت، نوکر نے شربت نیلوفر کٹورے میں گھول کر کوٹھے پر تیار کیا۔ اور کہا کہ ذرا اوپر تو تشریف لے چلیے۔ چوں کہ وہ اس وقت کچھ لکھوا رہے تھے۔ مصروفیت کے سبب سے نہ سمجھے۔ اور سبب پُوچھا۔ اُس نے اشارہ کیا۔ فرمایا کہ لے آ ئیں۔ یہ ہمارے یار ہیں۔ ان سے کیا چھپانا، جب اُس نے کٹورا لا کر دیا۔ تو یہ مطلع کہا کہ فی البدیہہ واقع ہوا تھا:

پلائے آشکار ہم کو کس کی ساقیا چوری
خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

محبوب علی خاں خواجہ سرا سرکار بادشاہی میں مختار تھے۔ اور کیا محل کیا دربار دونوں جگہ اختیار قطعی رکھتے تھے۔ مگر بشدت جوا کھیلتے تھے۔ کسی بات پر ناخوشی ہوئی۔ میاں صاحب نے حج کا ارادہ کیا۔ ایک دن میں اُستاد مرحوم کے پاس بیٹھا تھا۔ کہ کسی شخص نے آ کر کہا۔ میاں صاحب کعبۃ اللہ جاتے ہیں۔ آپ ذرا تامل کر کے مسکرائے اور یہ مطلع پڑھا:۔

جو دل قمار خانہ میں بُت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

والد مرحوم نے بہ نیت وقف امام باڑہ تعمیر کیا۔ ایک دن تشریف لائے۔ اُن سے تاریخ کے لئے کہا۔ اُسی وقت تامل کر کے کہا۔ تعزیت گاہِ امام دارین۔ پُوری تاریخ ہے۔ حکیم میر فیض علی مرحوم ان کے اُستاد بھی تھے۔ اور انھی کا آپ علاج بھی کیا کرتے تھے ایک دن میں بھی موجود تھا۔ نوکر نے آ کر کہا۔ کہ آج میر فیض علی کا انتقال ہوا۔ بار بار پوچھا اور ایسا اضطراب ہوا کہ اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔ کچھ سوچ کر دفعتاً بولے کہ ہائے کہ ہائے میر فیض علی۔ مجھ سے کہا کہ دیکھو تو یہی تاریخ ہے؟ حساب کیا تو عدد برابر تھے۔

ایک شخص نے آ کر کہا کہ میرے دوست کا نام علی ہے اور باپ کا نام غلام محمد ہے اس نے نہایت تاکید سے فرمائش لکھی ہے۔ کہ حضرت سے ایسا سجع کہوادو کہ جس میں دونوں نام آ جائیں۔ آپ نے سُن کر وعدہ کیا اور کہا کہ دو تین دن میں آپ آئیے گا۔ انشاءاللہ ہو جاوے گا۔ وہ رُخصت ہو کر چلے، ڈیوڑھی کے باہر نکلے ہوں گے جو نوکر سے کہا کہ محمد بخش بُلا نا انھیں لینا، خوب ہوا ان کے تقاضے سے جلدی مخلصی ہوگئی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

پدر غلام محمد پسر غلام علی

دیوان چندولال نے ان کا کلام سُن کر مصرع طرح بھیجا اور بُلا بھیجا۔ غزل کہہ کر بھیجی اور مقطع میں لکھا:۔

آج کل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن
کون جائے ذوق پر دِلّی کی گلیاں چھوڑ کر

انھوں نے خلعت اور پانسو روپے بھیجے۔ مگر یہ نہ گئے۔ ایک دن میں نے نہ جانے کا سبب پُوچھا فرمایا:۔

نقل:۔ کوئی مسافر دِلّی میں مہینہ بیس دن رہ کر چلا۔ یہاں ایک کتا ہل گیا تھا۔ وہ وفا کا مارا ساتھ ہولیا۔ شاہدرہ پہنچ کر دِلّی یاد آئی اور رہ گیا۔ وہائی کے کتوں کو دیکھا۔ گردنیں فربہ، بدن تیار، چکنی چکنی پشم۔ ایک کتا انھیں دیکھ کر خوش ہوا۔ اور دِلّی کا سمجھ کر بہت خاطر کی۔ حلوائیوں کے بازار میں لے گیا۔ حلوائی کی دوکان سے ایک بادشاہی اُڑا کر سامنے رکھا۔ بھٹیارہ کی دُکان سے ایک کلّہ جھپٹا۔ یہ ضیافتیں کھاتے اور دِلّی کی باتیں سُناتے رہے۔ تیسرے دن رُخصت مانگی۔ اس نے روکا۔ انھوں نے دِلّی کے سیر تماشے اور خوبیوں کے ذکر کیے۔ آخر چلے اور دوست کو بھی دِلّی آنے کی تاکید کر آئے۔ اُسے بھی خیال رہا۔ اور ایک دن دِلّی کا رُخ کیا پہلے ہی مرگھٹ کے کتے مردار خوار، خونی آنکھیں کالے کالے مُنہ نظر آئے۔ یہ لڑتے بھڑتے نکلے۔ دریا ملا، دیر تک کنارہ پر پھرے۔ آخر کود پڑے۔ مرکھپ کے پار پہنچے۔ شام ہوگئی تھی۔ شہر میں گلی کوچوں کے کتوں سے بچ بچا کر ڈیڑھ پہر رات گئی تھی، جو دوست سے ملاقات ہوئی۔ یہ بیچارے اپنی حالت پر شرمائے بظاہر خوش ہوئے اور کہا او ہو اس وقت تم کہاں۔ دل میں کہتے تھے کہ رات نے پردہ رکھا ورنہ دن کو یہاں کیا دھرا تھا۔ اسے لے کر اِدھر اُدھر پھرنے لگے۔ یہ چاندنی چوک ہے۔ یہ دریبہ ہے۔ جامع مسجد ہے۔ مہماں نے کہا۔ یار بُھوک کے مارے جان نکلی جاتی ہے۔ سیر ہو جائے گی۔ کچھ کھلواؤ تو سہی۔ انہوں نے کہا۔ عجب وقت تم آئے ہو۔ اب کیا کروں۔ بارے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جانی کبابی مرچوں کی ہانڈی بھول گئے تھے۔ اُنھوں نے کہا۔ لو یار بڑے قسمت والے ہو۔ وہ دن بھر کا بھوکا تھا۔ مُنہ پھاڑ کر گرا اور ساتھ ہی مُنہ سے مغز تک گویا باروت اُڑگئی۔ چھینک کے پیچھے ہٹا۔ اور جل کر کہا۔ واہ یہی دِلّی ہے۔ انہوں نے کہا۔ اس چٹخارے ہی کے مارے تو پڑے ہیں۔

عادت تھی کہ سات آٹھ بجے مکان ضرور جاتے تھے۔ اور تین چار چلمیں حقہ کی وہاں پیتے تھے۔ میں چھٹی کے دن اس وقت جایا کرتا تھا اور دن بھر وہیں رہتا تھا۔ مکان ضرور ڈیوڑھی میں تھا۔ پاؤں کی آہٹ پہچانتے تھے۔ پوچھتے تھے۔ میں تسلیم عرض کرتا۔ چھوٹی سی انگنائی تھی۔ پاس ہی چارپائی۔ وہیں بیٹھ جاتا۔ فرماتے اجی ہمارا وہ شعر اُس دن تم نے کیا پڑھا تھا؟ ایک دو لفظ اس کے پڑھتے، میں سارا شعر عرض کرتا۔ فرماتے، ہاں اب اسے یوں بنالو۔ ایک دن ہنستے ہوئے پاٹخانے سے نکلے۔ فرمایا کہ لو جی ۳۳ برس کے

بعد آج اصلاح دینی آئی ہے۔ حافظ ویران نے کہا۔ حضرت کیوں کر؟ فرمایا۔ ایک دن شاہ نصیر مرحوم کسی شاگرد کو اصلاح دے رہے تھے۔ اس میں مصرع تھا۔

کھاتی کمر ہے تین بل اک گدگدی کے ساتھ

ابتدائے مشق تھی اتنا خیال میں آیا کہ یہاں کچھ اور ہونا چاہیے۔ اور جب سے اکثر یہ مصرع کھٹکتا رہتا تھا۔ آج وہ نکتہ حل ہوا۔ عرض کی حضرت پھر کیا؟ فرمایا۔

کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

کمر کو اوپر ڈال دو عرض کی پھر وہ کیونکر، ۳۔۴ مصرع اُلٹ پلٹ کیے تھے ایک اِس وقت خیال میں ہے

بل بے کمر کہ زلف مسلسل کے پیچ میں
کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

کابلی دروازہ پاس ہی تھا۔ شام کو باہر نکل کر گھنٹوں ٹہلتے تھے۔ میں اکثر ساتھ ہوتا تھا۔ مضامین کتابی، خیالات علمی افادہ فرماتے۔ شعر کہتے۔ ایک دن بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے۔ تیر ہمیشہ۔ تصویر ہمیشہ۔ سوچتے سوچتے کہنے لگے۔ تم بھی تو کچھ کہو۔ میں نے کہا کیا عرض کروں۔ فرمایا۔ میاں! اسی طرح آتا ہے۔ ہوں۔ ہاں۔ غوں۔ خاں کچھ تو کہو۔ کوئی مصرع ہی سہی۔ میں نے کہا۔

سینہ سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

ذرا تامل کر کے کہا ہاں درست ہے

آجائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہیے
سینہ سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

اب جو کبھی دِلّی جانا ہوتا ہے۔ اور اس مقام پر گزر ہوتا ہے۔ تو آنسو نکل پڑتے ہیں۔

فرماتے تھے کہ ایک باشاہ نے غزل کا مسودہ دیا اور فرمایا کہ اسے ابھی درست کر کے دے جانا۔ موسم برسات کا تھا ابر آ رہا تھا۔ دریا چڑھاؤ پر تھا۔ میں دیوانِ خاص میں جا کر اسی رُخ میں ایک طرف بیٹھ گیا اور غزل لکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ دیکھا تو پشت پر ایک صاحب دانائے فرنگ کھڑے ہیں۔ مجھ سے کہا۔ آپ کیا لکھتا ہے؟ میں نے کہا غزل ہے پوچھا آپ کون ہے؟ میں نے کہا کہ نظم میں حضور کی دُعا گوئی کیا کرتا ہوں۔ فرمایا۔ کس زبان میں۔ میں نے کہا اُردو میں۔ پوچھا آپ کیا کیا زبانیں جانتا ہے؟ میں نے کہا فارسی عربی بھی جانتا ہوں۔ فرمایا اُن زبانوں میں بھی کہتا ہے۔ میں نے کہا

کوئی خاص موقعہ ہوتا تو اِس میں بھی کہنا پڑتا ہے ورنہ اُردو ہی میں کہتا ہوں کہ یہ میری اپنی زبان ہے۔ جو کچھ انسان اپنی زبان میں کرسکتا ہے غیر کی زبان میں نہیں کرسکتا۔ پوچھا آپ انگریزی جانتا ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا کیوں نہیں پڑھا؟ میں نے کہا ہمارا لب لہجہ اِس سے موافق نہیں وہ ہمیں آتی نہیں ہے۔ صاحب نے کہا۔ وَل یہ کیا بات ہے۔ دیکھیے ہم آپ کا زبان بولتے ہیں۔ میں نے کہا۔ پختہ سالی میں غیر زبان نہیں آسکتی، بہت مشکل معاملہ ہے۔ اُنھوں نے پھر کہا وَل۔ ہم آپ کی تین زبان ہندوستان میں آکر سیکھنا۔ آپ ہمارا ایک زبان نہیں سیکھ سکتے۔ یہ کیا بات ہے؟ اور تقریر کو طول دیا۔ میں نے کہا۔ صاحب ہم زبان کا سیکھنا اُسے کہتے ہیں کہ اس میں بات چیت ہر قسم کی تحریر تقریر اِس طرح کریں۔ جس طرح خود اہلِ زبان کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔ ام آپ کا تین زبان سیکھ لیا۔ بھلا یہ کیا زبان ہے اور کیا سیکھنا ہے۔ اسے زبان کا سیکھنا اور بولنا نہیں کہتے اسے تو زبان کا خراب کرنا کہتے ہیں۔